بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

معلوم نہیں صدرِ مملکت ذوالفقار علی بھٹو سنجیدگی سے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لیے عوام کے ذہنوں کو تیار کر رہے ہیں یا اس ملک کے ستم زدہ لوگوں کے ساتھ، جن کے زخموں سے ابھی تک خون رِس رہا ہے، دل لگی فرما رہے ہیں۔ اُن کے طرزِ عمل کے بارے میں یہ اشتباہ اس لیے پیدا ہُوا ہے کہ جس وقت سے اُن کے محسن فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب نے انہیں گمنامی کے دھندلکوں سے نکال کر شہرت و ناموری کے سنگھاسن پر بٹھایا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک اُن کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے بارے میں بجز ایک بات کے کہ مسندِ اقتدار اور اُس کے جاہ و جلال کے ساتھ انہیں ایک والہانہ وابستگی رہی ہے، کوئی بات بھی یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ ہر لمحہ رنگ بدلنے کو، عوام کے جذبات سے کھیلنے کو، ہر بات پر شیخی بگھارنے کو، بغیر سوچے سمجھے غیر ذمہ دارانہ باتیں منہ سے نکالنے کو، جہاں تعاون کی ضرورت ہے وہاں مزاحمت اور مخالفت کو اور جہاں ڈٹنے اور پامردی دکھانے کا موقع ہو وہاں جھکنے اور سرنگوں ہونے کو غالباً انہوں نے سیاست بازی خیال کر رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ سیاست کا کافی حصہ چالاکی اور عیاری پر مشتمل ہے لیکن اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اِس میں ایک بہت بڑا عنصر سنجیدگی اور وقار کا بھی ہے۔ ماضی قریب اور حال میں جتنے نامور سیاست دان میدانِ سیاست میں نمودار ہوتے ہیں اُن سب میں ایک بات قدرِ مشترک کے طور پر نظر آتی ہے کہ وہ اپنی نجی زندگیوں میں خواہ کتنے ہی مسخرے اور غیر سنجیدہ ہوں مگر قومی اور ملکی مسائل میں بڑی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُن کے فکر میں گہرائی، قول میں پختگی اور عزم میں ثبات ہوتا ہے۔ وہ کوئی بات بھی اُس وقت تک مُنہ سے نہیں نکالتے جب تک اُس پر اچھی طرح غور نہیں کر لیتے اور کوئی قدم اُس وقت تک نہیں اٹھاتے جب تک کہ اُس کے نتائج اور عواقب کا ہر زاویۂ نگاہ سے جائزہ نہیں لے لیتے۔

گذشتہ بارہ سال سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی متحرک زندگی کے مختلف گوشے مختلف حیثیتوں سے عوام کے سامنے آ رہے ہیں۔ قوم نے انہیں فیلڈ مارشل ایوب خاں کے مصاحبین اور درباریوں کے جلو میں ایک وزیر کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے۔ پھر انہیں ایوب خاں کی مخالفت اور مخاصمت میں بھی سرگرم عمل پایا ہے۔ اس کے بعد انہیں عوام کے جذبات میں ہیجان پیدا کر کے مسندِ اقتدار سنبھالتے بھی دیکھا ہے۔ اور اب دس ماہ کی کارگزاری کا نقشہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ مگر ہم نے بارہ سال کی اس طویل مدت میں انہیں کوئی ٹھوس اور دانشمندانہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ ایوب خاں کے ساتھ انہوں نے پہلے آٹھ سال تو اس درجہ نیازمندی سے گزارے کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی اپنی کوئی الگ فکر اور سوچ نہیں۔ ان کا بیشتر وقت فیلڈ مارشل صاحب کی ثنا خوانی میں گزرتا تھا۔ وہ انہیں ملک کے واحد نجات دہندہ کی حیثیت سے ہر محفل اور مجلس میں پیش کرتے رہے اور انہیں یہ باور کراتے رہے کہ جو شخص یا گروہ بھی آپ سے اختلاف کرتا ہے اسے پاکستان میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس ملک میں بلا شرکتِ غیرے صرف آپ کا راج قائم ہونا چاہیے اور جو فرد بھی اس کے خلاف لب کشائی کرتا ہے وہ وطن اور قوم کا دشمن ہونے کی بنا پر گردن زدنی ہے۔ اس سارے عرصے میں بھٹو صاحب ایوب صاحب کو اپنے مخالفین کو ختم کرنے، خصوصاً دینی طبقوں کو مٹانے اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں کو سرکاری پارٹی کے عہدے تفویض کرنے کا مشورہ دیتے رہے۔

جب اپنے اس محسن اور مربی سے اختلاف ہوا تو انہوں نے معاہدۂ تاشقند کے بارے میں عوام کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مسئلے کو خوب اچھالا اور سادہ لوح عوام کو یہی تاثر دیا کہ وہ اِس پٹاری سے کوئی بڑی خوفناک چیز نکالنے والے ہیں۔ اس معاہدے کی بین بجا کر انہوں نے عوام کو اپنے گرد جمع کیا۔ پھر جھوٹی توقعات اور امیدوں کے سحر سے اُن کے ہوش و حواس کو معطل کیا۔ اور اپنے مخالفین کے خلاف نہایت مکروہ پراپیگنڈہ کر کے تختِ اقتدار پر پہنچنے کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اور بالآخر "اُدھر تم اِدھر ہم" کا نعرہ لگا کر ایسے حالات پیدا کیے کہ عنانِ اقتدار پر ان کا قبضہ ہو ہی گیا۔ جب ہم صدر بھٹو صاحب کی گذشتہ بارہ سال کی سرگرمیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ محض کھیل تماشا معلوم ہوتی ہیں۔ معاہدۂ تاشقند کی پٹاری کو سامنے رکھ کر مجمع بازی کا کام تو خوب لیا گیا مگر اس میں سے کوئی خوفناک چیز برآمد نہ ہو سکی۔ جھوٹی توقعات سے عوام کو مسحور کر لیا گیا مگر اس سحر سے اِن بیچاروں کی شبِ تاریک کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ البتہ کوتہ اندیشوں کو کچھ وقت

کے لیے اُفق کے کناروں پر صبح کے آثار دکھائی دینے لگے۔ مگر جلد ہی اُن پر حقیقت آشکار ہو گئی کہ یہ صبح صادق نہیں بلکہ صبح کاذب ہے جس کا مقصد دھوکے سے شبِ تاریک کو طوالت دینا ہے۔

مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد بھی اُن کے طرزِ عمل میں کوئی فرق واقع نہیں ہُوا۔ جس مارشل لا کو وہ تمام بُرائیوں کی جڑ سمجھتے تھے اُسے برقرار رکھنے پر پہلے مُصر رہے اور اُس کے لیے فضا ہموار کرنے کی پُوری پُوری کوشش کی۔ مگر جب مخالف جماعتوں نے جبر و اکراہ کے ساتھ اِس لعنت کو ایک معینہ مدت تک گوارا کرنا قبول کر لیا تو دفعتاً اس کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اِس آناً فاناً اعلان کا مقصد یہ تھا کہ اس لعنت سے نجات دلانے کا سہرا کہیں حزبِ اختلاف کے سر نہ بندھ جائے بلکہ وہ تنہا صدرِ قوم کی پیشانی کی زینت بنے۔ اِسی طرح وہ ایوب خاں کے حلقۂ ارادت سے نکلنے کے بعد اور تختِ اقتدار سنبھالنے سے پہلے صدارتی نظام کے مخالف اور وفاقی پارلیمانی نظام کے پُرجوش مبلغ اور داعی رہے اور ہر جگہ یہی کہتے رہے کہ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہمارے لیے پارلیمانی نظام ہی صحیح اور مناسب ہے۔ مگر اقتدار پر قابض ہونے کے فوراً بعد ہی صدارتی نظام کے گُن گائے جانے لگے۔ اور اسے ملک و ملت کے لیے کیمیائے سعادت ثابت کیا جانے لگا۔ اسے برقرار رکھنے پر اِس قدر زور دیا گیا کہ پُورا ایوانِ حکومت متزلزل ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں نہ صرف وزیرِ قانون اپنے عہدے سے الگ ہو گئے بلکہ بعض نمایاں کارکنوں نے بھی حکومت سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔

بھٹو صاحب کی اِس سیماب آسا طبیعت اور طفلانہ مزاج نے ہمیں بین الاقوامی طور پر بھی اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے اور دنیا کی نظروں میں ہمارا قومی وقار ناقابلِ بیان حد تک گرا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ان صاحب نے یو۔ این۔ او میں جو تقریر ارشاد فرمائی اور جس کے معرکہ آرا ہونے کا ملک میں خوب چرچا کیا گیا وہ محض ایک جذباتی تقریر تھی جو ممکن ہے کہ موچی دروازے کے جلسے کے لیے تو موزوں ہو مگر بین الاقوامی مُدبّرین کی مجلس کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہ تھی۔ امریکہ اور انگلستان کے پریس نے الفاظ کے تھوڑے سے تغیّر و تبدل کے ساتھ اُسے ایک نابالغ اور خام سیاستدان کی سطحی جذباتیت سے تعبیر کیا۔ خصوصاً انہوں نے تقریر کے دوران بھارت کے نمائندے کو جن غیر شائستہ الفاظ سے مخاطب

کیا تھا اُس کی ہر جگہ مذمت کی گئی۔ وہ ملک کے اندر، یو۔این۔او کے اجلاس میں اور پریس کانفرنسوں میں بھارت کے خلاف ایک ہزار سال جنگ کرنے کی رٹ لگاتے رہے مگر جب ذرا خارجی دباؤ پڑا تو وہ اور ان کے مُربّی فوراً تاشقند روانہ ہو گئے اور وہاں اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ کو مذاکرات کی میز پہ ہار دیا اور اعلانِ تاشقند کے ساتھ ملک میں بے نیل و مرام لوٹے۔ معاہدۂ تاشقند کے سارے مراحل میں وہ ایوب خاں کے برابر کے شریک رہے۔ اُن کی جو تصاویر اُس وقت ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اُن میں انہیں اِس معاہدہ کی خوشی میں تالیاں پیٹتے ہوئے دیکھا گیا۔ ملک کے اندر واپس آنے کے بعد انہوں نے اس معاہدے کی بھرپور حمایت کی اور اُسے صدر محمد ایوب خاں کی فراست کا شاہکار قرار دیا۔ پھر اسمبلی میں انہوں نے اِس معاہدے کے حق میں پُورے ڈھائی گھنٹے جو تقریر ارشاد فرمائی اُس میں اس کی بے حد تعریف کی اور اسے پاکستان کی فتح سے تعبیر کیا۔ مگر جب فیلڈ مارشل صاحب سے اَن بن ہو گئی تو یہ معاہدہ ایک سازش بن گیا۔ اور اس کا ذمہ دار ایوب خان کو ٹھیرایا گیا۔ اور خود اس سے بالکل بَری ہو گئے۔ اگر یہ معاہدہ واقعی ایک سازش تھی تو تاشقند میں اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا جا سکتا تھا۔ اور وطن واپس آکر عوام میں اس امر کی دہائی دی جا سکتی تھی مگر اُس وقت تک اِس سازش کو اِخفا میں رکھا گیا بلکہ اس سازش کو صدرِ مملکت کا عظیم کارنامہ قرار دیا جاتا رہا یہاں تک کہ انہیں وزارتِ خارجہ کے منصب سے الگ کر دیا گیا۔ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں وزارت کا منصب ملکی مفاد سے کہیں زیادہ عزیز تھا اور جب اُس کے ساتھ چمٹے رہنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو پھر معاہدۂ تاشقند کے پسِ پردہ جو "سازش" تھی اُسے آشکارا کرنے کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں مگر آج تک اِس سازش سے ہزار وعدوں کے باوجود پردہ نہیں اٹھایا گیا اور وہ ابھی تک صیغۂ راز ہی میں ہے۔

اقتدار سے الگ ہونے کے بعد بھی اُن کی اس روش میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ اگر وہ باہر کی دنیا کی طرف متوجہ ہوتے تو بھارت کے خلاف ہزار سال تک جنگ کرنے کی دھمکیاں دیتے۔ کبھی اہلِ بھارت کو یہ وعید سناتے کہ وہ عنقریب لال قلعے پہ جھنڈا گاڑنے کے لیے اپنے لاؤ لشکر سمیت آرہے ہیں۔ کبھی وہ بھارت کے وزیر خارجہ کی نقلیں اُتارتے اور اُن کے دوسرے لیڈروں کا مذاق اڑاتے اور اس طرح جلسوں میں عوام کو ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کرتے۔ جب زبان پہ امریکہ کا ذکر آتا تو اُسے بھی خوب ملاحیاں سُناتے مگر چند لمحے بعد ہی

اگر امریکی پریس کے کسی نمائندے سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو پھر امریکہ بہادر کی تعریف و توصیف شروع کر دیتے۔ ملک کے اندر ایک ہی سانس میں اسلام کا دم بھرتے اور سوشلزم کا نعرہ بھی لگاتے۔ ایک جلسے میں سائنٹفک سوشلزم کے داعی کی حیثیت سے تقریر کرتے تو دوسرے جلسے میں اسلام کے جان نثار فدائی ہونے کا دعویٰ کرتے۔ اپنے آپ کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کا شدید دشمن قرار دیتے مگر اپنے دربار میں ان طبقوں کی سب سے زیادہ پذیرائی بھی کرتے۔ اور ان کے وجود سے اپنی مجالس سجاتے۔ اُن کے اِس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اُن کے بارے میں کوئی بات بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ اُن کے کسی قول پہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا جس شخص کی ساری سیاسی زندگی ہی لاف و گزاف اور کہہ مکرنی سے عبارت ہو اُس پہ اپنے اور پرائے کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔ اُن کے بعض انجان اور عقل سے عاری ساتھی اُن کے اِس طرزِ عمل کے دفاع میں یہ کہتے ہیں کہ سیاست اِسی کا نام ہے۔ لیکن انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ اِس قسم کے چھچھورے پن سے سیاست دان کی اپنی ذات اور اس کی قوم کے وقار کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ سیاست کی بساط قومی مفادات کی مہرہ بازی ہی سہی لیکن اس میں جتنی سنجیدگی اور وقار کا مظاہرہ کیا جائے اُسی قدر سیاست دان کی آبرو اور اُس کی قوم کی عزت بڑھتی ہے۔ ماضی قریب ہی میں ہمارے ہاں مسٹر محمد علی جناح کی صورت میں ایک ایسے نامور سیاستدان ہوئے ہیں جن کی سیاسی قابلیت کا سکہ مسلمان تو کیا غیر مسلم تک مانتے ہیں مگر دیکھیے کیا ان کی زبان سے کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں نکلیں جنہیں آج مسٹر بھٹو فخر سے ادا کرتے ہیں، کیا انہوں نے کبھی ایسی طفلانہ حرکتیں کیں جنہیں وہ آج اپنی سیاست بازی کا سب سے بڑا امتیاز سمجھتے ہیں؟ کیا انہوں نے کبھی اپنے مخالفین کو اسی انداز کی سُوقیانہ گالیاں دیں جو آج صدر بھٹو کی زبان سے سننے میں آتی ہیں؟ کیا انہوں نے بھی اپنے مخالفین کی نقلیں اُتار کر اور ان کے سوانگ بھر کر سامعین کو ہنسانے کی کبھی کوشش کی؟ کیا وہ بھی اِسی طرح کی لاف زنی کے عادی تھے جس طرح کی لاف زنی بھٹو صاحب کا آج شیوہ بن گئی ہے؟ کیا انہوں نے بھی اہم معاملات کے فیصلے کے لیے وہ انداز اختیار کیا جو انداز بھٹو صاحب نے مجیب کی رہائی کے لیے اختیار کیا تھا، یا آج بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے لیے کر رہے ہیں؟ اسلامی سیاست تو خیر اخلاق اور سنجیدگی کے نہایت اونچے معیار کی طالب ہوتی ہے مگر مغربی سیاست میں بھی ان صفات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اگر بساطِ سیاست سے یہ صفات ناپید ہو جائیں تو پھر سیاست دان اور مجمع باز میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟

علم نفس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جو شخص جس قدر لاف و گزاف سے کام لیتا ہے اور لوگوں کو دھمکیوں سے مرعوب کر کے انہیں خاموش کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ انتہائی بزدل ہوتا ہے۔ اور جو شخص سستی شہرت کے حصول کی خاطر اوچھے ہتھیار استعمال کرتا ہے یا جذبات کے اندر ہیجان پیدا کر کے اپنا کام نکالنے کا عادی ہوتا ہے اس کا دل اخلاص سے خالی ہوتا ہے۔ جلسوں کے اندر عوامی زبان استعمال کرنا اور اپنے آپ کو عوام کا خیر خواہ ثابت کرنے کے لیے مُنہ سے گالی تک نکال دینا، ہجوم کے اندر بھنگڑا ڈالنا اور سیٹیاں بجا کر رقص کرنا عوام دوستی کا کوئی صحیح معیار نہیں۔ عوام کی حقیقی خیر خواہی اور ان سے سچی محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر عوام کی سطح پر اُتار کر انہیں یہ باور کرایا جائے کہ وہ اُن میں سے ہے بلکہ عوام دوستی کا صحیح اقتضاء یہ ہے کہ عوام کی سطح کو بلند کرنے کے لیے پُورے اخلاص، دلسوزی اور دلجمعی سے کوشش کی جائے۔ جس طرح کوئی ہوشمند طبیب، مریض سے ہمدردی کا اظہار اپنے آپ کو وہ مرض لگا کر نہیں کرتا جس میں کہ مریض مبتلا ہے بلکہ اُس بیمار کو بیماری سے نجات دلانے کے لیے مخلصانہ کوشش کے ذریعے کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح کسی قوم کا حقیقی بہی خواہ اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں کرتا کہ قوم جن عوارض میں مبتلا ہے وہ سارے اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں بلکہ قوم کو اُن سے بچانے کے لیے پُوری قوت سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے جو اسے اندر ہی اندر گھُن کی طرح کھوکھلا کر رہے ہیں۔ یُوں تو اس سلسلہ میں کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ وہ شخص جو شراب کا عادی ہے اُس کا کوئی بہی خواہ اُسے شراب کے جام پیش کر کے اور شرابیوں کی سی حرکات و سکنات اختیار کر کے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ ام الخبائث کی مضرتیں بیان کر کے اور ساغر و مینا توڑ کر اس کی خیر خواہی کا فرض سر انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی زندگی میں سطحی جذباتیت کو فروغ دے کر کوئی سربراہِ قوم نہ اپنی قوم کو سنجیدگی کا سبق دے سکتا ہے اور نہ خود ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ملک و ملت کو درپیش سنگین مسائل کے بارے میں کوئی مفید اور مثبت رائے قائم کرنے کے قابل بنا سکتا ہے۔ بنا بریں اپنے صدرِ مملکت سے ہماری گزارش یہ ہے کہ قوم کو جو روگ پہلے سے لگے ہوئے ہیں یا خود حصولِ اقتدار کے زمانے میں انہوں نے لگائے ہیں یا جن امراض میں ان کے غلط کار پیشرو اِس ملت کو مبتلا کر چکے ہیں اب برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کے مداوا کی فکر کریں اور ملکی مفاد کے مطابق صحیح سمت میں قدم اٹھائیں۔ اس کا فائدہ کسی اور کو نہیں خود اُن کو پہنچے گا۔ لیکن اگر قوم کے مزاج کو خراب کرنے والی اور ملکی مفاد سے متصادم سرگرمیاں

انہوں نے جاری رکھیں جیسا کہ بنگلہ دیش کے مسئلہ پر عوامی انداز اختیار کر کے جاری رکھے ہوئے ہیں تو خطرہ ہے کہ اُن کی یہ غیر سنجیدہ روش نہ صرف اس قوم کو بالکل ناکارہ بنا کر رکھ دیگی بلکہ انہیں اپنی انتہائی محبوب اور دل پسند چیز (اقتدار) سے بھی بہت جلد محروم کر دے گی۔

بھٹو صاحب کے دَورۂ سرحد کی جو تفصیلات اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں اُن میں علاوہ اور بہت سی مضحکہ خیز باتوں کے ایک یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ وہ جماعت اسلامی اور اس کے بانی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی اور علمی موقف پر بھی اظہار کرنے لگے ہیں اور اس وجہ سے وہ ترجمان القرآن اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اِس معاملے میں ہماری اُن سے استدعا ہے کہ وہ چونکہ ملک کے سربراہ ہیں اس لیے انہیں اپنے بلند منصب اور مرتبہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنے عاقبت نا اندیش مشیروں کے کہنے سننے پر اپنے آپ کو اضحوکہ نہ بنانا چاہیے، کیونکہ اُن کی جگ ہنسائی سے ملک و ملّت کی رُسوائی ہوتی ہے۔ آپ کو اگر مولانا کے خلاف کچھ کہنا ہی ہے اور اُن پر سبّ و شتم کیے بغیر آپ کو اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہوتا تو بہتر یہی ہے کہ آپ اُنہیں اور اُن کے رفقاء کار کو "فکس اپ" کرنے کی دھمکیاں دے کر اپنے دل کا غبار نکال لیا کریں۔ مولانا کے افکار و نظریات اور اُن کے سیاسی موقف پر علمی انداز میں نقد و نظر نہ آپ کے بس میں ہے اور نہ آپ اس کے اہل ہیں، اور نہ آپ کے ساتھیوں میں اس کا کوئی اہل نظر آتا ہے۔ جو لوگ اپنے مخالفین کو گالیاں اور دھمکیاں دینے کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے ممتاز سمجھتے ہوں اُن سے کسی علمی طرزِ استدلال کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے۔ وہ جس کام میں ماہر ہیں انہیں وہی کام کرنے دیجیے اور آپ خود بھی ان علمی بحثوں میں نہ اُلجھیں، کیونکہ پھر آپ اپنے اصل میدان کو چھوڑ کر ایک ایسے میدان میں آ جائیں گے جو آپ کے مزاج اور ذہنی ساخت کے اعتبار سے آپ کے لیے بالکل موزوں نہیں، اس لیے آپ کے جوہر کھلنے کے بجائے آپ کی سُبکی ہوگی۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ جب عوام آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے مجلہ ترجمان القرآن کا نام بھی غلط سنتے ہیں اور جب آپ انہیں یہ بتاتے ہیں کہ "مولانا نے "سیاسی کشمکش" میں پانچ قومیتوں کی تائید کی ہے" تو آپ کی علمی قابلیت اور آپ کے مطالعے کی وسعت کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ترجمان القرآن کو لوگ گذشتہ ۳۸ برس سے پڑھ رہے ہیں، وہ اس کے مندرجات سے پوری طرح واقف ہیں۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" پاکستان بننے سے پہلے اُن کے زیرِ مطالعہ ہے اور وہ اس کے موضوع سے بھی (باقی صفحہ ۸۴ پر)